رسائل و مسائل

قادیانیوں کی غلط تاویلات

سوال۔ قادیانی مبلغ اپنا انتہائی زور اجرائے نبوت کے ثبوت پر صرف کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل دو آیتیں خصوصی طور پر پیش کرتے ہیں اور انہی پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھتے ہیں:

۱۔ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (النساء۔ ۶۹)

"اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔"

اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان آیات میں بالترتیب چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ اُنکی دانست میں ان میں سے تین درجے یعنی صدیقین، شہدا اور صالحین تو اُمت محمدیہ کو مل چکے ہیں، لیکن چوتھا درجہ نبی ہونا باقی تھا۔ اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ملا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر معیت کا مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کے لوگ قیامت کے دن صرف مذکورہ گروہ کی رفاقت میں ہونگے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت محمدیہ میں کوئی صالح، شہید اور صدیق ہے ہی نہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر جب آیت میں چار مراتب (گروہوں) کا ذکر کیا گیا ہے تو پھر گروہ انبیا کے اُمت میں موجود ہونے کو کس دلیل کی بنا پر مستثنیٰ کیا جاتا ہے۔

۱۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (اعراف۔ ۳۵)

"اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس میرے رسول آئیں جو تم پر میری آیات پڑھیں پس جو ڈرا اور اصلاح کر لی ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس آیت سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب تمام نوع انسانی سے ہے۔ اور نزول کے لحاظ سے یہ آیت نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر اجرائے نبوت مقصود نہ ہوتا تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت کیوں نازل ہوتی۔ نیز یہ کہ اس میں مضارع کا صیغہ (یاتینکم) مع نون ثقیلہ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "بالفرض تمہارے پاس میرے نبی آئیں گے"۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم کی فرماں برداری میں نبی آسکتا ہے۔

آپ سے استدعا ہے کہ اس مسئلہ پر اپنے رسالے میں مدلل بحث فرمائیں، تاکہ یہ افادہ عام کا موجب ہو۔

جواب۔ جب کسی مسئلے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے بالکل صاف اور صریح نصوص میں کر دیا ہو تو پھر اسی مسئلے میں ان نصوص کو چھوڑ کر دوسری آیات و احادیث سے جو دراصل اس خاص مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے وارد نہیں ہوئی ہیں، اپنے مطلب کے معنی نکالنا اور نصوصِ قطعیہ کے بالکل خلاف عقیدہ یا عمل اختیار کر لینا درحقیقت انتہائی گمراہی، بلکہ خدا اور رسول کے خلاف بدترین بغاوت ہے۔ جو شخص علانیہ اللہ اور اس کے فرمان کے خلاف کوئی مسلک اختیار کرتا ہے وہ تو کم تر درجے کی بغاوت کرتا ہے۔ مگر یہ بہت زیادہ بڑے درجے کی بغاوت ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کے فیصلے کے خلاف خود اللہ اور رسول ہی کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگے۔ یہ کام جو لوگ کرتے ہیں ان کے متعلق ہم کسی طرح بھی یہ فرض نہیں کر سکتے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں۔

یہ سوال کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں یا نہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ اور آیت يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیتوں کی طرف صرف اسی صورت میں رجوع کر سکتے تھے جبکہ اللہ اور اس کے رسول نے خاص طور پر اسی سوال کا جواب کسی خاص نص میں نہ دے دیا ہوتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت خاتم النبیین میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بکثرت احادیثِ صحیحہ میں ہم کو خاص طور پر اسی سوال کا واضح جواب مل چکا ہے تو آیت وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ اور يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اور ایسی ہی دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا، اور پھر ان سے نصوص قطعیہ صریحہ کے خلاف مطالب نکالنا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خدا سے بالکل بے خوف ہو چکا ہو اور جسے یہ بھی یقین نہ

ہو کہ کبھی مر کر خدا کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تعزیرات پاکستان کی ایک خاص دفعہ میں ایک فعل کو بالفاظِ صریح جرم قرار دیا گیا ہو، اور کوئی شخص اس دفعہ کو چھوڑ کر قانون کی دوسری غیر متعلق دفعات کا جائزہ اس غرض کے لیے لیتا پھرے کہ کہیں سے کوئی اشارہ اور کہیں سے کوئی نکتہ نکال کر اور پھر انہیں جوڑ جاڑ کر اُسی فعل کو جائز ثابت کر دے جسے قانون کی ایک صریح دفعہ جرم قرار دے رہی ہے۔ اس طرح کا استدلال اگر دنیا کی پولیس اور عدالت کے سامنے نہیں چل سکتا، تو آخر یہ خدا کے ہاں کیسے چل جائیگا۔

پھر جن آیات سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں بجائے خود ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں سے وہ مضمون آخر کہاں نکلتا ہے جو یہ لوگ زبردستی ان سے نچوڑنا چاہتے ہیں۔

پہلی آیت جو آپ نے نقل کی ہے اس میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیا و صدیقین اور شہدا و صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس سے یہ مضمون کیسے نکل آیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ یا تو نبی ہو جائیں گے یا صدیق یا شہید یا صالح۔ پھر ذرا سورۂ حدید کی آیت ۱۹ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ "اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی صدیقین اور شہداء ہیں اپنے رب کے نزدیک"۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان کے نتیجے میں جو دولت کسی کو مل سکتی ہے وہ صرف صدیق اور شہید ہو جانے کی ہے۔ رہے انبیاء تو ان کی معیت نصیب ہو جانا ہی اہلِ ایمان کے لیے کافی ہے۔ کسی عمل کے انعام میں کسی شخص کا نبی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر سورۂ نساء کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء اور صدیقین و شہداء کے ساتھ ہونگے۔ اور سورۂ حدید کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے خود صدیق اور شہداء بن جائیں گے۔

دوسری آیت ایک سلسلۂ بیان سے تعلق رکھتی ہے جو سورۂ اعراف میں آیت ۱۱ سے ۴۶ تک مسلسل چل رہا ہے۔ اس سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ بنی آدم سے یہ خطاب آغاز تخلیق انسانی میں کیا گیا تھا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں صرف اسی مقام پر بیان نہیں ہوا ہے بلکہ سورۂ بقرہ آیت ۳۸، ۳۹ میں بھی قریب قریب اسی طرز پر آیا ہے۔ اس کو پڑھ کر یہ مطلب کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ ان

آیات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کا ذکر ہے۔ اس میں تو اس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب حضرت آدم اور ان کی بیوی کو جنّت سے نکال کر زمین پر لایا گیا تھا۔

مسیح کے ابن اللہ ہونے کا بے اصل عقیدہ

سوال۔ میں ایک عیسائی کی حیثیت میں آپ سے ہم کلام ہو رہا ہوں۔ ایک مسیحی ادارے کی جانب سے مجھے ایک مقالہ تیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کے متعلق اسلامی نقطہ نظر واضح کیا گیا ہو۔ آپ مجھ سے زیادہ اس امر سے آگاہ ہیں کہ جب حضرت مسیح یا کسی اور کے لیے یہ لقب استعمال کیا جاتا ہے تو مسلمان بالعموم اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کا جو موقف ماضی یا حال میں رہا ہے، اسے صحیح طور پر پیش کرنے کے لیے میں آپ کی رائے کو خاص اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے:

۱۔ حضرت عیسیٰ کے لیے "ابن اللہ" کے لقب کا استعمال عام طور پر مسلمانوں کے لیے کیوں ناقابلِ قبول ہے؟ کیا آپ بھی اس معاملے میں عامۂ مسلمین کے ہم نوا ہیں؟

۲۔ اس مسئلے میں آپ کے پاس اپنے نقطۂ نظر کے حق میں قرآن یا حدیث کی رُو سے کیا دلائل ہیں؟

۳۔ کیا "ابن اللہ" کی ترکیب کا استعمال کسی حالت میں صحیح اور قابلِ تسلیم بھی ہو سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کوئی استثنا ایسا ممکن ہے کہ ان الفاظ کو مجازی یا غیر مادی معنوں میں حضرت عیسیٰ کے لیے استعمال کیا جا سکے؟ کیا "ابن اللہ" کو کلی نہیں تو جزوی حیثیت ہی سے "کلمۃ اللہ" کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

۴۔ انجیل (عہدِ جدید) میں حضرت عیسیٰ کے لیے "ابن اللہ" کثرت سے مستعمل ہونے کی توجیہ آپ کے نزدیک کیا ہو سکتی ہے؟ کیا آپ کے نزدیک یہ تحریف یا اضافہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ کب اور کیوں ہوا؟

جواب ۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر پیش کرنے کی دعوت دی ہے۔ آپ کے سوالات کا مختصر جواب یہ ہے کہ قرآن اس مضمون کی بالکل صاف، قطعی اور غیر مبہم طریقے سے صراحت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی معنی میں بھی کوئی بیٹا نہیں ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے، نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے۔ اس کی طرف اولاد کو منسوب کرنا قطعی شرک ہے۔ مسیح علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول تھے نہ کہ اس کے بیٹے۔ ان کی کوئی خصوصیت اس کے سوا نہ تھی کہ اللہ نے اپنے خاص حکم سے ان کو کنواری مریم کے پیٹ سے باپ کے بغیر پیدا کیا۔ اسی وجہ سے ان کو "اللہ کا کلمہ" اور "اللہ کی طرف سے ایک روح" کہا گیا۔ لیکن اس خصوصیت کی بنا پر ان کے اندر الوہیت کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ان کی اس خصوصیت میں حضرت آدم بھی ان کے شریک اور مشابہ ہیں کیونکہ انہیں بھی بغیر باپ کے براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ اگر معجزانہ پیدائش کی بنا پر حضرت آدم خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہو گئے تو حضرت عیسیٰؑ کیسے ہو گئے۔

اس کے لیے براہِ کرم قرآن مجید کی حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیے:

البقرہ: ۱۱۶-۱۱۷	مریم: ۸۸ تا ۹۳	آل عمران: ۴۵ تا ۵۱	المائدہ: ۷۲ تا ۷۵
الانعام: ۱۰۱	الانبیاء: ۲۵ تا ۲۹	آل عمران: ۵۹	المائدہ: ۱۱۶ تا ۱۱۸
یونس: ۶۸	المؤمنون: ۹۱	النساء: ۱۷۱-۱۷۲	التوبہ: ۳۰-۳۱
الکہف: ۴-۵	الاخلاص: ۳	المائدہ: ۱۷	مریم: ۱۶ تا ۷۵

قرآن کی یہ تصریحات ایسی صاف اور واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی حدیث یا تفسیر کو نقل کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں جو بات قرآن سے صاف صاف ثابت ہو جائے وہ پھر کسی اور ثبوت کی محتاج نہیں رہتی۔

انجیل میں مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ کیسے آیا اس کے متعلق میرے لیے کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ خود حسب ذیل تین باتوں کی تحقیق کر کے کوئی رائے قائم کریں:

اوّل، بائبل کے عہدِ جدید میں جو صحیفے درج ہیں کیا ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے اصل الفاظ میں

ہے اور انسانی کلام اس کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے؟

دوم، کیا مسیح علیہ السلام نے خود کہیں اپنے لیے "ابن اللہ" کا لفظ استعمال کیا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ ابن اللہ کے بجائے اپنے لیے ابن آدم کا لفظ بولتے تھے؟ اور اگر حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کا مفہوم ان کے خدا کو باپ کہنے سے اخذ کیا جائے تو کیا انہوں نے خدا کو مخصوص طور پر صرف اپنا ہی باپ کہا ہے؟ کیا بائیبل میں ایسی بکثرت مثالیں موجود نہیں ہیں جن میں اللہ کو عام انسانوں کا باپ بھی کہا گیا ہے؟

سوم، کیا جو بات مسیح کی اپنی تعلیم سے ثابت نہ ہو وہ کسی اور کے بیان کرنے سے ایک مسلّم عقیدہ قرار پانی چاہیے؟ خصوصاً جبکہ وہ مسیح کے تعلیم کیے ہوئے عقیدۂ توحید کے خلاف پڑتی ہو اور جس کی بدولت انسان خدا پرستی کے ساتھ ساتھ مسیح پرستی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہو؟

ان تین سوالات کو نگاہ میں رکھ کر اگر آپ بائیبل کے عہد جدید کا محققانہ (غیر متعصبانہ) مطالعہ فرمائینگے تو آپ پر خود واضح ہو جائے گا کہ مسیح علیہ السلام کے متعلق اُن کے پیروؤں میں "ابن اللہ" کا عقیدہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیشوا کی محبت و عقیدت میں بے جا غلو کیا ہے۔ ورنہ خود بائیبل میں کہیں نہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ مسیح میرا بیٹا ہے، اور نہ مسیح کا اپنا کوئی قول ایسا موجود ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ جب نہ خدا نے ایسا کہا اور نہ مسیح نے ایسی کوئی خبر دی تو آخر دوسرے لوگوں کو یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ مسیح علیہ السلام معاذ اللہ خدا کے بیٹے تھے؟

آٹھ رکعت اور بیس رکعت کی بحث

سوال۔ آپ کا ایک جواب دربارہ تراویح ہفت روزہ "ایشیا" لاہور مورخہ ۳/۶۲ء میں شائع ہوا۔ جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مسئلے کی کوئی عالمانہ تحقیق نہیں کی۔ بلکہ ایک چلتی سی بات سمجھوتہ کرانے والوں کی سی کر دی ہے جس سے مسئلہ بجائے سلجھنے کے اُلجھ گیا ہے۔ ایک طرف آپ فرماتے ہیں کہ آنحضرت کی تراویح آٹھ رکعت ہی تھیں۔ دوسری طرف آپ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس جاری کیں۔ اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کیا۔ اور بعد کے خلفاء نے اسی کو دستور بنایا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سنت نبوی آٹھ ہی ہے۔ تو پھر حضرت عمرؓ نے بیس کہاں سے لے لیں۔ اور کیونکر ان کو مقرر کر دیا۔ تمام صحابہ اور خلفاء نے سنت نبوی کو نظر انداز کر کے بیس پر کیسے اجماع کر لیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صحابہ ایسی جسارت کریں۔ (مولانا۔ یا تو آٹھ سنت نبوی نہیں۔ یا پھر بیس پر اجماع نہیں)

جب سنت نبوی بقول آپ کے آٹھ ہی رکعت ہیں۔ تو بجائے یہ کہنے کے کہ حضرت عمرؓ نے بیس جاری کیں، کیا یہ کہنا زیادہ قرین قیاس نہیں کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ ہی جاری کی تھیں۔ کیونکہ اوّلاً تو مسنون تعداد آٹھ ہی ہے۔ ثانیاً اتباع سنت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ آٹھ جاری کرتے۔ ثالثاً روایت کے اعتبار سے ثابت بھی یہی ہے کہ حضرت عمرؓ نے آٹھ ہی پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ جیسا کہ مؤطا امام مالک کی سائب بن یزید کی روایت سے ظاہر ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عن السائب بن یزید انه قال امر عمرؓ ابی بن کعب وتمیماً الداری ان یقوما الناس فی رمضان باحدی عشر رکعات (الحدیث)

حضرت عمرؓ نے ابی بن کعب اور تمیم داری کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگوں کو رمضان شریف میں گیارہ رکعتیں پڑھایا کریں۔ (بحوالہ مشکوٰۃ)

قال الباجی لعل عمر اخذ ذالک من صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔

باجی نے کہا، حضرت عمرؓ نے آٹھ کی تعداد شاید صلوٰۃ رسول سے لی ہے (تنویر الحوالک)

عن مالک انه الذی جمع علیه الناس عمر بن الخطاب احب الی وهو احدی عشر رکعة وهی صلوٰة رسول اللہ علیه وسلم قیل له احدی عشرة رکعة بالوتر۔ قال نعم وثلث عشرة قریب۔ قال ولا ادری من این احدث هذا الرکوع الکثیر۔

امام مالکؒ نے فرمایا جتنی رکعتوں پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو جمع کیا وہ مجھے زیادہ پیاری ہیں، اور وہ گیارہ رکعت ہی ہیں، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے، ان سے پوچھا گیا، گیارہ رکعت مع وتر کہا ہاں اور تیرہ رکعت قریب ہے اور کہا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ بہت سارے رکوع یعنی رکعتیں کہاں سے ایجاد کر لی گئی ہیں۔ (المصابیح فی صلوٰۃ التراویح سیوطی)

آپ کا جواب دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا، کہ جب سنت نبوی آٹھ تھیں تو حضرت عمرؓ نے بیس رکعت کیوں جاری کیں۔ کیا ان کے نزدیک سنتِ رسول کی کوئی وقعت نہ تھی۔ یا سنت کی پیروی میں ثواب کی کمی کا احتمال تھا۔ یا بیس کے پڑھنے میں آٹھ کی نسبت اُمت کو آسانی تھی۔ یا بیس میں آٹھ کی نسبت خشوع و خضوع زیادہ ہو سکتا تھا۔ آخر کونسی ایسی مصلحت تھی۔ کون سا ایسا داعیہ تھا۔ جو حضرت عمرؓ نے ایک آسان سنتِ نبوی کا اہمال کر کے ایک مشکل کام کا اُمت کو حکم دیا۔

مذکورہ بالا حدیث جو سنداً بھی صحیح ہے اور متناً بھی، اتباعِ سنت کی آئینہ دار بھی ہے اور صحاح سے ہم آہنگ بھی۔ آپ نے اس کو تو چھوڑ دیا اور ضعاف کو لے لیا۔ جو کہ نہ روایتاً صحیح ہیں اور نہ درایتاً آخر کیوں؟ آپ کے نزدیک احادیث کے رد و قبول اور اس کی ترجیح کے کونسے پیمانے ہیں جن سے آپ ماپ تول کرتے ہیں۔ مہربانی فرما کر واضح تو کریں تاکہ ہم بھی کوئی اندازہ کر سکیں۔

جواب۔ "ایشیا" اور "شہاب" میں میرے درس کے جو خلاصے شائع ہوتے ہیں، ان کے متعلق بارہا خود ان دونوں اخبارات میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ وہ میرے اصل الفاظ میں نہیں ہوتے، نہ میری پوری بات ان میں نقل کی جاتی ہے، اور نہ وہ مجھے دکھا کر شائع کیے جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان خلاصوں کو پڑھ کر میرے اوپر آئے دن سوالات کی بوچھاڑ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ان کی جواب دہی کرتے کرتے میں تنگ آگیا ہوں۔ میں ان خلاصوں کی اشاعت پر صرف اس لیے راضی ہوا تھا کہ ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز اور کوثر نیازی صاحب کے خیال میں اس طرح میرے درس کا کچھ نہ کچھ فائدہ عام ناظرین کو بھی حاصل ہوتا رہیگا۔ لیکن اگر اُن پر سوالات کی پیدائش اسی رفتار سے جاری رہی جیسی اب تک رہی ہے تو مجھے مجبوراً ان دونوں حضرات سے یہ گزارش کرنی پڑیگی کہ اس سلسلے کو روک دیں۔ آخر میں دوسروں کی مرتب کردہ رپورٹوں کی جواب دہی کہاں تک کرتا رہوں۔

تراویح کی رکعات کا مسئلہ اُن مسائل میں سے ہے جن پر مدت دراز کے جھگڑوں اور مناظروں نے فریقین کو بے انتہا ذہنی الجھن بنا دیا ہے۔ اسی وجہ سے آٹھ رکعت یا بیس رکعت کا لفظ کسی کی زبان سے نکلتے ہی کوئی ایک گروہ اس پر آستینیں چڑھا لیتا ہے اور چیلنج بازی شروع کر دیتا ہے . . . . . .

مذکورۂ بالا سوال اسی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر اتنے جھگڑوں کی کوئی حاجت ہو۔ اگر کسی کے نزدیک آٹھ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ آٹھ پڑھے اور خواہ مخواہ ۲۰ رکعت کو بدعت قرار دینے پر اپنا زور صرف نہ کرے۔ اور اگر کسی کے نزدیک ۲۰ رکعت ہی ثابت ہوں تو وہ ۲۰ پڑھے اور آٹھ رکعت پڑھنے والوں کی مخالفت میں وقت ضائع نہ کرتا رہے۔ دُنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو اس سے بدرجہا زیادہ اہم مسائل درپیش ہیں جو ہماری توجہ اور محنت اور اوقات اور اموال کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر ان مسائل پر جھگڑے اور بحثیں کرنے میں سارا زور لگا دینا خدا کے دین کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

محترم سائل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آٹھ رکعت سے زائد پڑھنا خلاف سنت ہے، اور اس دعوے کی بنا اُنہوں نے اس بات پر رکھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح میں آٹھ ہی رکعت پڑھی ہیں۔ حالانکہ اگر اس بنیاد پر آٹھ رکعت سے زائد پڑھنے کو خلاف سنت کہنا درست ہو تو پھر تمام عمر میں تراویح صرف تین مرتبہ ہی جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیئے اور اس سے زائد پڑھنے کو بھی خلافِ سنت قرار دے دیا جانا چاہیئے۔ اس لیئے کہ حضور سے باجماعت تراویح صرف اسی حد تک ثابت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس معاملہ میں حضرت عمر کا یہ اجتہاد کہ ہر رمضان میں بالالتزام تمام مساجد میں ہر روز باجماعت تراویح کا اہتمام کیا جائے، آپ نے قبول فرما لیا اور اسے خلاف سنت قرار نہیں دیا تو آخر تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کرنے کے بارے میں ان کا اجتہاد کس دلیل سے خلاف سنت ہو گیا۔

سائل فاضل کی یہ کوشش کہ حضرت عمر سے ۲۰ رکعت کے ثبوت ہی میں سرے سے شک پیدا کر دیا جائے، درحقیقت مکابرہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بات قریب قریب یقینی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمر نے تراویح کے لیے ۲۰ رکعت مقرر کی تھیں، صحابہ نے اسے قبول کیا، اور ان کے بعد بھی خلفاء اور صحابہ کا عمل اس پر رہا۔ ترمذی کا بیان ہے:

واکثر اھل العلم علی ما روی عن عمر وعلی وغیرھما من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرین رکعۃ۔	اکثر اہلِ علم اسی مسلک پر ہیں جو حضرت عمر اور حضرت علی اور اُن کے علاوہ دوسرے صحابہ سے مروی ہے، یعنی ۲۰ رکعت۔

محمد بن نصر المروزی نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت اُبی بن کعب اور متعدد دوسرے صحابہ کا اثر بتایا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جمہور علماء ۲۰ رکعت ہی کے قائل ہیں اور صحابہ سے اس بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہوا ہے۔ المغنی میں ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"امام احمد بن حنبل کے نزدیک تراویح کے معاملہ میں ۲۰ رکعت ہی کا مسلک مرجح ہے اور اسی کے قائل سفیان ثوری اور ابو حنیفہ اور شافعی ہیں۔ مگر امام مالک ۳۶ کے قائل ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ قدیم سے اسی پر عمل چلا آرہا ہے..... اس کے مقابلے میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرت نے جب متفرق طور پر تراویح پڑھنے والے تمام لوگوں کو اُبی بن کعب کی امامت میں جمع کیا تو حضرت اُبی ۲۰ رکعتیں پڑھاتے تھے..... اور حضرت علی سے بھی یہی ثابت ہے کہ اُنہوں نے ایک شخص کو رمضان میں ۲۰ رکعت تراویح پڑھانے پر مامور کیا تھا۔ یہ عمل قریب قریب اجماع کا ہم معنی ہے..... اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ بعد میں تمام اہل مدینہ ۳۶ رکعت تراویح پڑھنے لگے تھے تب بھی جو کچھ حضرت عمر نے کیا تھا اور جس پر صحابہ ان کے زمانے میں متفق ہو گئے تھے اسی کی پیروی کرنا زیادہ بہتر ہے۔" (جلد اوّل۔ ص ۷۹۸ - ۷۹۹)

اس کے مقابلہ میں محترم سائل کا تمام تر اعتماد صرف اس روایت پر ہے جو امام مالک نے مؤطا میں سائب بن یزید سے نقل کی ہے اور جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے وتر سمیت ۱۱ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ اسی مؤطا میں امام مالک یزید بن رومان کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے وتر سمیت ۲۳ رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر محترم سائل نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا۔ دوم یہ کہ وہی سائب بن یزید جن سے امام مالک ۱۱ رکعت کی روایت نقل کرتے ہیں، ان سے ایک دوسری روایت بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ ۲۳ رکعت کے حق میں نقل کی ہے، اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اگر پہلے ۱۱ رکعتیں مقرر کی بھی تھیں تو بعد میں ان کو ۲۳ رکعت سے

بدل دیا ہوگا۔ سوم یہ کہ امام مالک خود ان دونوں روایتوں پر عمل نہیں کرتے بلکہ ۳۶ رکعتوں کے حق میں اس بنا پر فیصلہ دیتے ہیں کہ مدینے میں ایک صدی سے زیادہ مدّت سے تین رکعت وتر اور چھتیس رکعت تراویح پڑھنے کا طریقہ رائج تھا۔ سیوطی المصابیح میں جو کچھ چاہیں کہیں مگر فقہائے مالکیہ اپنے امام کا یہی قول صحیح مانتے ہیں

اِن امور پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعتیں ہی پڑھی ہیں لیکن صحابہ اور تابعین نے بالعموم حضور کے اس فعل کا مطلب یہ نہیں لیا ہے کہ آٹھ رکعت پڑھنا ہی سنت ہے اور اس سے زائد پڑھنا خلاف سنت یا بدعت ہے۔ آخر یہ کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین سنت اور بدعت کے درمیان تمیز کرنے کی اہلیت سے اس درجہ محروم تھے، یا جان بوجھ کر وہ سنت کو چھوڑ کر ایک بدعت کو اختیار کر سکتے تھے؟

بہرحال اگر کوئی شخص حضور کے اس فعل کو اسی معنی میں لیتا ہو کہ آپ کا منشا ۸ رکعت ہی کو سنت کی حیثیت سے جاری کرنے کا تھا تو وہ شوق سے اس پر عمل کرے، اور جو اس معاملہ میں اس کے ہم خیال ہوں وہ اس کی پیروی کریں۔ لیکن ۲۰ رکعت کے دلائل اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اسے خلاف سنت قرار دینا اتنا آسان ہو جتنا سمجھ لیا گیا ہے۔

عائلی قوانین اور شریعت

سوال ۔ کیا عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد کوئی شخص اگر شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے تو وہ واقع ہو جائے گی؟ متذکرۂ صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ ہونے کے لیے کچھ خاص شرائط عائد کر دی گئی ہیں۔

جواب ۔ کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں۔ اس لیے جو طلاق شرعی قواعد کی رُو سے دیدی گئی ہو وہ عند اللہ اور عند المسلمین نافذ ہو جائیگی خواہ ان قوانین کی رُو سے وہ نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہو گی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ قرار دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیے کہ وہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات خدا اور رسول کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق۔